

تفسیر "سورہ البقرہ" (آیات 47 تا 50)

<?xml encoding="UTF-8?">

"يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنْیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (47)

اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جس وقت میں نے تمہیں نوازا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام خلائق سے زیادہ عطا کیا

؛؛؛

قرآن کریم میں متعدد جگہ فضل کا لفظ مال و دولت وغیرہ کی زیادتی کے مفہوم میں آیا ہے۔ جیسے :

"فَمَا الَّذِیْنَ فَضَّلُوا بِرَادِیْ رِزْقِهِمْ عَلَی مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ"

تو جنہیں زیادہ دیا گیا ہے وہ ایسا نہیں کرتے کہ جو انہیں ملا ہے اسے پلٹا دیں انکی طرف جو انکی ملکیت میں

ہیں (غلام وغیرہ) " (النحل#71) دوسری جگہ "فضلتکم علی العالمین" کی تشریح یوں آئی ہے :

"واذْقَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهِ یَقُوْمُ اِذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلَ لَکُمْ مَلٰوِکَ وَ اَتَاکُمْ مَّالَ مِمَّا یُّؤْتِ اَحَدًا مِّنَ

العالمین" (المائدہ#21) جس کا ترجمہ پہلے آچکا ہے۔ اسی لیے "فضلتکم علی العالمین" کا ترجمہ میں نے کثرت

عطا سے کیا ہے۔ فضیلتِ مرتبہ سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر "یاد کرو" کا لفظ جو شروع میں ہے بتاتا ہے کہ یہ ماضی کا ذکر ہے ، حال میں تو کفران کے سبب سے وہ

نعمت و فضیلت سب سلب ہو چکی ہے۔

**

"وَاَتَّقُوا یَوْمًا لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ یُنصَرُوْنَ (48).

اور اس دن سے بچنے کا سامان کرو جب نہ کوئی دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ کسی کی سفارش قبول

ہوگی اور نہ کسی کا کوئی معاوضہ لیا جائیگا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی"

؛؛؛

جیسا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے

"اس دن سے مراد ظاہر ہے کہ یومِ قیامت ہے۔ قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی۔ حشر و نشر، جزا

و سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسئولیت اور ذمہ داری کی روح ہے، اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں

کہنا چاہیئے کہ انکی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا۔ آگے روزِ قیامت کے جو اوصاف بیان ہوئے

ہیں سب میں کسی نہ کسی طرح اسرائیلی عقیدہ کی رد ہی ہے۔

"لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ" اس سے مقصود اس اسرائیلی عقیدہ کی رد ہے جو آج تک جیوش انسائیکلو پیڈیا میں

ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے۔ "بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی

بنا پر بخش دیئے جائیں گے۔ (جلد 6 ص 61)

"ولا یقبل منها شفاعۃ" (جس صورت میں کہ موت حالتِ کفر پر اور عدمِ ایمان ہوئی ہے) یہاں بھی رد ہے اس

اسرائیلی عقیدہ کا کہ عمل اور عقیدے کیزے ہی ہوں بہر حال اپنے اسلافِ کرام شفاعت کر کے بخشوا ہی لیں

گے۔ شفاعت اور ایک شفیع مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔

"لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ" اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفارہ پر ہے۔ مسیحیوں کے یہاں عقیدہ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے لیکن خود یہود بھی اس عقیدہ کفارہ سے متاثر ہو کر قائل ہو گئے تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد 2 ص 278)"

بے شک اسلام میں بھی شفاعت کا عقیدہ ہے اور وہ قرآن سے بھی ثابت ہے مگر اس میں اسرائیلی عقیدہ کی طرح نہ عمومیت ہے نہ اس طرح قطعیت، بلکہ وہ خاص اہل ایمان کے لیے خدا تعالیٰ کے اذن و رضا کے ساتھ مشروط ہوتے ہوئے مایوسیوں کی گھنگھور گھٹا میں صرف ایک امید کی چمک دکھا کر توجہ الی اللہ کو تازہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس طرح نہ اس میں نجات پر اعتماد کلی ہے جس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہ ہو جو اسرائیلی عقیدہ کا لازمہ ہے اور نہ یاس کامل ہی ہے جس کے بعد گناہگار اپنے کو دوزخی سمجھ کر پھر اصلاح نفس کو بیکار سمجھ لے، بلکہ اسلام کی تعلیمات ان دونوں نقطوں کو چھوڑ کر بین بین ہے اور یہی اس کا طرہ امتیاز ہے

"الایمان نصفان نصف خوف ونصف رجاء"

ایمان کے دو حصے ہیں ایک حصہ خوف ہے اور ایک حصہ امید ہے

**

"وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۗ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (49)۔"

اور اس وقت جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے چھٹکارا دیا جو تمہیں بری طرح تکلیفیں پہنچاتے تھے، تمہارے لڑکوں کو حلال کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی

؛؛؛

"تمہیں" یہ نسبت اور اس کے بعد کی تمام نسبتیں جو اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں ہیں موجودہ بنی اسرائیل کی طرف قومی حیثیت سے دی گئی ہیں ورنہ حقیقتاً تو جنہیں نجات دی گئی تھی اور جن پر یہ واقعات گزرے تھے وہ اس مخاطب سے بہت صدی پہلے کے ان کے آباؤ اجداد تھے۔

فرعون کسی خاص آدمی کا نام نہیں ہے بلکہ مصر کا ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا جیسے ایران کا ہر بادشاہ کسری اور روم کا قیصر اور حبشہ کا نجاشی۔

بنی اسرائیل پر جن مظالم کا حوالہ قرآن مجید نے دیا ہے انکا ذکر توریت میں بھی موجود ہے۔ مصریوں نے

خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب

خدمت کھیت کی کروا کے انکی زندگی تلخ کی۔ انکی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی

تھیں۔ (خروج 13:1 و 14) لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کے زندہ رکھے جانے کا جو فرعون کی طرف سے حکم تھا

اسکا بھی ذکر ان الفاظ میں ہے کہ "فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم

اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی پیدا ہو جیتی رہنے دو۔ (خروج 15:1 و 22)

لڑکیوں کے زندہ رہنے کی غرض نہ تو توریت میں صراحۃً مذکور ہے اور نہ قرآن میں مگر اسے مصائب کے ذیل

میں درج کرنے ہی سے ظاہر ہے کہ یہ زندہ رکھنا لڑکیوں کا کچھ ایسے مقاصد کے لیے تھا جنکی بہ نسبت نفسیاتی طور سے مار ڈالنا زیادہ گوارا ہوسکتا ہے۔

ظلم کا مرتکب اگرچہ ظالم ہوتا ہے اور وہی اپنے ارادہ و اختیار کی بنا پر اسکا ذمہ دار ہے مگر خداوندِ عالم کی طرف سے اسکا موقع دیا جانا کہ وہ ظلم کرسکے اور اسکا اپنی طاقت سے مزاحمت نہ کرنا کبھی بطور سزا ہوتا ہے جسے مذہبی روایات میں ان الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے کہ اللہ نے ظالمین کو مسلط کردیا اور کبھی بطور امتحان ہوتا ہے جس میں کامیابی کی صورت میں وہ مظلومین کو اپنے انعام و اکرام کے ساتھ سرفراز کرتا ہے۔ آلِ فرعون کے ان مظالم کو جو بنی اسرائیل پر تھے قرآن نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔

**

"وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَ أَعْرَفْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (50)۔"

اور جب ہم نے تمہارے ذریعہ سے دریا میں شگاف دیدیا اس طرح تمہیں چھٹکارا دلایا اور فرعون والوں کو ڈبو دیا اس حالت میں کہ تم دیکھ رہے تھے"

؛؛؛

فرعونی حکومت کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے خالق کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کو لیکر مصر کی سرزمین سے نکلے کہ اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کی طرف روانہ ہو جائیں۔ فرعون نے اپنی فوج کو ساتھ لیکر ان کا تعاقب کیا۔ وہ لوگ اتفاق سے شب کی تاریکی میں راستہ بھول کر دریا کے قریب پہنچ گئے تھے کہ پس پشت سے فرعونی لشکر آگیا۔ اب یہ لوگ پریشان ہوئے کہ آگے دریا اور پیچھے دشمنوں کی فوج۔ وحی خداوندی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام قوم کو حکم دیا کہ وہ بلاتامل دریا کی طرف قدم آگے بڑھا دیں۔ ان نے بڑھنے کے ساتھ ہی دریا کا پانی بیچ سے پھٹ گیا۔ اسکی بڑی بڑی موجیں اُدھر اُدھر دیواروں کی طرح کھڑی ہوگئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے ساتھ اُس طرف کے ساحل تک پہنچ گئے مگر جب فرعون اپنے لشکر سمیت دریا کی حدود میں پہنچ گیا تو دونوں طرف سے پانی کی موجیں پلٹ پڑیں اور انہوں نے اس تمام لشکر کو غرق کردیا۔

یہ واقعہ توریت میں بھی مذکور ہے "پھر موسیٰ (ع) نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا اور خداوند بہ سبب بڑی پوری آندھی کے تمام رات میں دریا کو جلایا اور دریا کو سکھادیا اور پانی کو دو حصے کیا اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہوکر گزر گئے اور پانی کی ان کے داھنے دیوار بائیں دیوار تھی۔ (خروج 14:7 و 21 و 23) بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی کی ان کے داھنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔ (خروج 14:39 و 30)

اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کیے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اسکی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے اور موسیٰ (ع) نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھا دیا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر لوٹا اور مصری اس کے آگے بھاگے اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا اور پانی پھرا اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپالیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔ (خروج 14:23 و 24)

اسی واقعہ کا تذکرہ قرآن مجید کر رہا ہے۔

فرق کا جو مفہوم عربی میں ہے اُسے اس سے سمجھنا آسان ہوگا کہ مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دریا میں راستہ پیدا ہونا جزرومد کا کوئی کرشمہ نہ تھا جیسا کہ بعض مادی نقطہ نظر والے افراد نے جو کسی معجزہ ماننے پر تیار نہیں ہوتے 'توہم' کہا ہے۔

'بکم' کے لفظ سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تمہارے داخلہ کے ساتھ ہی پانی نے راستہ دیا۔ (1) رہ گئی عقلی حیثیت سے اس پر بحث تو وہ ایک مستقل کلی موضوع کا جزئیہ ہے جو معجزات انبیاء سے متعلق ہے اور جس پر بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ روح مطلب یہ ہے کہ دریا کا اس طرح شگافتہ ہو جانا محال عقلی تو ہے نہیں صرف محال عادی سمجھا جا سکتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عام طور پر ایسا ہوا نہیں کرتا لیکن خدا کو ماننے کے بعد پھر اسکی قدرت کو محدود سمجھنا معقول چیز نہیں ہے۔

اگر بنظر حقیقت شناس سے دیکھیے تو دریا کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا خود سمندر کے وجود سے زیادہ حیرت خیز چیز نہیں ہے۔ پھر وہ جو اس کے پیدا کرنے پر قادر تھا وہ کسی وقت اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے۔

عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس پر طبیعی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہاں جس 'فرق البحر' کا ذکر ہے تو یہ سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارقِ عادت ہے بھی نہیں کہ اسکی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو۔ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں چنانچہ جنوری 1944 اور رمضان 1354 میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار اور اطرافِ بہار میں آیا اس موقع پر صوبہ کے صدر مقام پٹنہ شہر میں دن دھاڑے کوئی ڈھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشمِ زدن میں غائب ہو گیا اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سیکنڈ نہیں چار پانچ منٹ قائم رہا یہاں تک کہ دریا اسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے اُبل کر پھر جاری ہو گیا۔ واقعہ کی مفصل روداد ایک وقائع نگار کے قلم سے انگریزی روزنامہ 'پانیر لکھنؤ' کی 20 جنوری 1944 کی اشاعت میں درج ہے"

"بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقافت کو دھوکا ہو گیا ہے بلکہ بحرِ قلزم یا بحرِ احمر مراد ہے۔ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا۔ نیل سے اس راستے کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحرِ قلزم تھا۔ اس کے تنگ شمالی راستے کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں اب نہر سوئز کھد گئی ہے اس سے متصل مغرب میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں تقسیم نظر آئیگا۔ یہاں ان میں سے مغربی مثلث مراد ہے اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے "جزیرہ نمائے سینا" میں قدم رکھا تھا"

علامہ بلاغی نے لکھا ہے :

"البحر هو خليج السويس من البحر الاحمر و عرضه بحسب اختلاف مواقعہ نحو عشرة امبال الى نحو عشرين ميلا"

بحر سے مراد نہر سوئز ہے جو بحرِ احمر سے نکلی ہے اور اسکی چوڑائی ان مختلف موقعوں کے اعتبار سے دس میل سے تقریباً بیس میل تک ہے " (آلاء الرحمن)

